سعید احمد اکبر آبادی

شریعت بدلتے ہوئے زمانے میں

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اجتہادات کی روشنی میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب نئے مسائل اور نئے معاملات پیش آئے تو صحابہ کرام میں دو مختلف قسم کے حضرات تھے۔ ایک طبقے کا خیال تھا کہ ہم کو شریعت کے جو احکام براہ راست قرآن مجید یا سنت سے جس شکل میں ملے ہیں ہم کو ہر حالت میں ان کا پابند رہنا چاہیے اور حالات خواہ کیسے ہی ہوں، ہم ان احکام میں تغیر و تبدل کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اس طبقے کے بالمقابل ایک دوسرا گروہ تھا جس کا خیال تھا کہ احکام شریعت کی بنیاد منفعت عامہ اور مصلحت انسانی پر ہے، اس لیے اگر منفعت و مصلحت کا تقاضا ہو تو احکام میں تبدیلی کی جا سکتی ہے اور شریعت کی آفاقی روح باقی رکھنے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر بھی ہے۔ پہلے طبقے کی نمائندگی حضرت ابو بکر صدیق کرتے تھے اور دوسرے طبقے کے نمائندہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ چنانچہ خلافت صدیقی میں ایسے مواقع متعدد بار پیش آئے جب کہ ان دونوں حضرات کا یہ اختلاف رائے، یا زیادہ صحیح لفظوں میں رجحان طبع کا اختلاف ابھر کر سامنے آیا۔ مثلاً" وفات نبوی کے فوراً" بعد تبوک کے لیے حضرت اسامہ بن زید کی سرکردگی میں جو لشکر جرار روانہ ہوا تھا، اس کے متعلق حضرت عمر کی رائے تھی کہ مدینہ کے حالات

تشویش انگیز ہیں، اس لیے مصلحت وقت کا تقاضا ہے کہ تبوک کی مہم کو سر دست ملتوی رکھا جائے، لیکن صدیق اکبر نے اس مشورے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تبوک کے لیے لشکر کی تربیت اور اس کی روانگی کا حکم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا، اس لیے اس حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ میں اس میں مصلحت کے پیش نظر دخل نہیں دے سکتا۔ اسی طرح جب بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ حضرت اسامہ نو عمر ہیں اور لشکر میں بزرگ اکابر صحابہ شریک ہیں، اس لیے مناسب ہے کہ قیادت تبدیل کر دی جائے، لیکن چونکہ حضرت اسامہ کا تقرر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کر گئے تھے، اسلیے حضرت ابو بکر صدیق اس پر بھی رضامند نہیں ہوئے۔

لیکن ایسے مواقع بھی متعدد آئے جب کہ حضرت ابو بکر صدیق کو حضرت عمر کی رائے اور مشورے کی معقولیت کا یقین ہو گیا اور اسے قبول کر لیا۔ مثلاً" جنگ یمامہ کے بعد، جس میں حفاظ و قرآء صحابہ کی ایک بڑی تعداد کام آ گئی تھی، حضرت عمر نے حضرت ابو بکر کو تدوین قرآن کا مشورہ دیا تو شروع میں آپ کو اس میں تردد ہوا اور فرمایا جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، میں اسے کرنے کی جرات کیسے کر سکتا ہوں لیکن جب حضرت عمر نے یقین دلایا کہ یہ کام احداث فی الدین (بدعت) ہرگز نہیں، بلکہ دین کے تحفظ اور بقا کے لیے بہت ضروری ہے، تو حضرت ابو بکر کو شرح صدر ہو گیا اور آپ نے اس پر عمل کیا۔ اس سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی لائق ذکر ہے۔

دو شخص ایک مرتبہ حضرت ابو بکر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم دونوں کو مولفتہ القلوب کی مد میں زکوٰۃ، صدقات و خیرات اور مال غنیمت میں سے حصہ دلواتے تھے، تو اب آپ بھی دلوائیے۔ خلیفہ اول نے فرمایا: ہاں ضرور۔ اس پر ان لوگوں نے ایک خاص بنجر زمین کا ذکر کر کے درخواست کی وہ زمین ان کے نام لکھ دی جائے۔

حضرت ابو بکر نے درخواست منظور کر لی اور ان کے نام زمین کا پروانہ تحریر فرما دیا' مگر ساتھ ہی فرمایا کہ اس پروانہ پر عمر سے تصدیق کرا لینا۔ اب یہ دونوں حضرت عمر کے پاس پہنچے اور پروانہ پیش کیا تو اسے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت ناراض ہوئے' پروانہ چاک کر دیا اور غصے کے لب و لہجہ میں فرمایا :جب تک اسلام کمزور تھا تم لوگوں کو مولفتہ القلوب کی حیثیت سے حصہ ملتا تھا' لیکن اب اسلام مضبوط اور توانا ہے' اس کو تالیف قلب کی ضرورت نہیں ہے' حضرت ابوبکر کو اس کی اطلاع ہوئی تو خاموش ہو گئے اور حضرت عمر کے خلاف کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ آپ نے بھی حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کر لیا۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ حضرت ابو بکر احکام شریعت میں عقل کے دخیل ہونے کے منکر نہیں تھے اور نہ وہ ہو سکتے تھے' کیوں کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ عقل سے کام لینے کی تاکید اور اس کا حکم موجود ہے اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کی مذمت کی گئی اور ان کو بہائم سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہاں شریعت کے غایت احترام اور عہد نبوت سے غایت قرب کے باعث جب کبھی کوئی نیا معاملہ پیش آتا تھا' حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس میں اپنی رائے سے کام لینے میں زیادہ جرات و جسارت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت ابو بکر کی یہی وہ صفت تھی جس کے باعث ان کو بارگاہ نبوت سے "صدیق" کا لقب عطا ہوا تھا۔

لیکن حضرت عمر میں اولاً تو دلیری اور اس کی وجہ سے جرات و جسارت فطری تھی اور پھر شریعت اور عقل کے درمیان ربط باہمی کا اذعان و یقین جذبہ خود اعتمادی کے ساتھ اس درجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رو برو بھی اس کا اظہار بیساختہ ہوتا رہتا تھا اور جہاں اکابر صحابہ کو جنبش لب کی ہمت نہ ہوتی' حضرت عمر کو اظہار مدعا میں پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب عہد نامہ لکھا جا رہا تھا' تو چونکہ اس میں مسلمانوں کا

پہلو بہ ظاہر دبا ہوا تھا اس لیے اس کی ناگواری سب کو تھی، لیکن سب خاموش تھے۔ حضرت عمر سے نہ رہا گیا، فوراً بول اٹھے: حضور! کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں، جو قریش مکہ سے اس طرح کا معاملہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے، صلح حدیبیہ کے واقعہ کے سلسلے میں مکہ مکرمہ بغیر ہتھیاروں کے جانے کا ارادہ فرمایا تاکہ کفار قریش کو شبہہ نہیں ہو، لیکن حضور صحابہ کرام کے ساتھ ذوالحلیفہ (مدینہ سے چھ میل دور ایک مقام کا نام) گئے تھے کہ حضرت عمر کی رائے ہوئی کہ معلوم نہیں آئندہ کیا صورت پیش آئے، بغیر ہتھیاروں کے چلنا مناسب نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے سے اتفاق کیا اور خود ایک آدمی بھیج کر مدینہ سے ہتھیار منگوا لیے۔ حضرت عمر کی اصابت رائے کا یہ عالم تھا کہ متعدد مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ کسی معاملے میں آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مشورہ دیا، یا اس سے متعلق اپنے رجحان طبع کا اظہار فرمایا اور اس کے بعد قرآن مجید کا حکم اسی کے مطابق نازل ہو گیا، مثلاً آیت حجاب میں مفسرین کے قول کے مطابق حضرت عمر کے منشا کے مطابق ہی نازل ہوئی ہے۔

حضرت عمر میں جو اجتہاد فکر اور روشن دماغی سے شریعت کے مسائل پر غور و فکر کرنے کی خداداد صلاحیت تھی، اور جس کو تائید نبوی کا شرف حاصل تھا اس کا اظہار قدرتی طور اس وقت زیادہ ہوا جب آپ مسند آرائے خلافت ہوئے۔ خلافت فاروقی کی مدت دس برس ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ کثرت فتوحات، مملکت اسلامی کی وسعت اور سوسائٹی میں ایک بحران کی کیفیت کے پیدا ہو جانے کے باعث سیکڑوں جدید قسم کے مذہبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل پیش آ رہے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ دوم کی حیثیت سے ان کا قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ اگرچہ ان امور و مسائل کے انصرام و انجام دہی کے لیے باقاعدہ و باضابطہ دارالافتا اور دارالقضا کے محکمے قائم تھے جن پر اکابر صحابہ

مقرر تھے، لیکن حضرت عمر ہر معاملے پر خود بھی غور و خوض فرماتے تھے۔ بہر حال اس معاملے میں آپ کا انداز تحکمانہ یا ڈکٹیٹر شپ کا ہرگز نہیں ہوتا تھا، بلکہ اپنی ذاتی رائے کو ارباب حل و عقد کے سامنے دلائل و براہین کے ساتھ پیش فرماتے، اسی پر بحث کرتے اور جب سب حضرات یا ان کی اکثریت حضرت عمر کی منفرد رائے کی تصدیق و تصویب کر دیتی، تب آپ اس کی تنفیذ کا حکم دیتے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ دس برس کی مدت خلافت میں کس کثرت سے ایسے مواقع پیش آئے ہوں گے جب آپ کو اپنے اجتہاد و فکر، رائے اور قیاس سے کام لے کر جدید مسائل کا فیصلہ کرنا پڑا ہو گا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے فاروق اعظم کے سب اجتہادات کو یکجا کر دیا ہے۔ جو رسالہ "ازالۃ الخفاء" میں شامل ہیں۔ اس مضمون میں تمام اجتہادات حضرت عمر کو نہ تو نقل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے، ہم یہاں صرف چند اجتہادات کا ذکر کریں گے۔ جن سے اندازہ ہو گا کہ حضرت عمر کس درجے کے نباض شریعت اور واقف اسرار ور موز احکام اسلامی تھے۔ مغربی مصنفین عام طور پر اور بعض کوتاہ اندیش مسلمان ارباب قلم بھی لکھتے ہیں کہ حضرت عمر نے متعدد احکام ایسے دیے ہیں، جو قرآن مجید یا سنت کے احکام کے خلاف ہیں۔ لیکن حق یہ ہے، حضرت عمر کا ایک حکم بھی قرآن و سنت کے حکم کے مخالف اور اس کی ضد نہیں ہے، بلکہ قرآن و سنت کے حکم کی صحیح مراد اور اس کے مقصد کی تعیین ہی کرتا ہے۔ اب ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں نقل کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ عرب میں شدید قحط پڑا، لوگوں کا جینا مشکل ہو گیا۔ حضرت عمر نے اس سلسلے میں جو اہم اقدامات کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ آپ نے اعلان فرما دیا کہ ان حالات میں اگر کوئی شخص چوری کرتا ہوا پکڑا جائے، تو اس کا قطع ید نہ کیا جائے۔ ایک مرتبہ دو غلام پکڑے گئے، حضرت عمر نے ان سے دریافت کیا: تم نے چوری کیوں کی، غلاموں نے جواب دیا: ہمارا آقا ہمیں پیٹ

بھرنے کے لائق کھانا نہیں دیتا۔ حضرت عمر نے یہ سن کر غلاموں کو تو رہا کر دیا' لیکن ان کے آقا کو بلا کر کوڑوں کی سزا دی۔ قرآن مجید میں حکم ہے "السارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما جزاء" بما کسبا نکالا من اللہ" اللہ کی طرف سے مقرر کردہ سزا کے طور پر' چور مرد ہو یا عورت' بہرحال جو کچھ اس نے کیا ہے اس کی پاداش میں ان کے ہاتھ کاٹ دو۔ حضرت عمر کا مذکورہ بالا عمل بہ ظاہر قرآن کے حکم سے انحراف نظر آتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر' جن سے بڑھ کر مزاج شناس شریعت اور کون ہو سکتا تھا' اس نکتے سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ قرآن مجید کا حکم اگرچہ مطلق ہے' لیکن دنیا میں کوئی مطلق ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ کچھ شرائط اور قیود نہ ہوں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کے باعث اصول فقہ میں آیا ہے: مامن عام الاخص عنه البعض یعنی کوئی عام ایسا نہیں ہے جس میں کچھ تخصیص نہ ہو' اس بنا پر حضرت عمر یہ سمجھتے تھے کہ بیشک قرآن مجید میں چوری کی سزا قطع ید مقرر کر دی گئی ہے' لیکن جرم کا ثبوت اور اس کی تحقیق کا فیصلہ ارتکاب جرم کے محرکات کو پیش نظر رکھے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمر کے اس فیصلے اور حکم کی روشنی میں بعض فقہاء نے کہا ہے کہ حد سرقہ کا نفاذ اس وقت ہوگا' جب کہ معاشرے میں خوش حالی اور فارغ البالی ہو اور کسی شخص کو چوری کرنے کی ترغیب نہ ہو سکتی ہو۔

2- شام کی فتح کے بعد جب مسلمانوں اور رومیوں میں معاشرتی تعلقات پیدا ہوئے چوں کہ رومی خواتین بڑی حسین و جمیل ہوتی تھیں' اس لیے مسلمانوں میں ان سے شادی کرنے کا رجحان عام ہو گیا۔ حضرت عمر کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے اس کی ممانعت کر دی۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ "رومی خواتین اہل کتاب سے تعلق رکھتی ہیں اور قرآن مجید میں ان سے نکاح کرنے کو جائز کہا گیا ہے تو پھر کسی کو اسے ممنوع قرار دینے کا کیا حق ہے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: میں کسی حلال کو حرام نہیں کر

رہا ہوں اور نہ مجھے یا کسی اور کو اس کا حق ہے' لیکن یہ سوچتا ہوں کہ اگر عرب خواتین سے نکاح کرنے کا رجحان اسی طرح ترقی کرتا رہا تو پھر دو شیزگان عرب کا انجام کیا ہو گا۔ فقہی نقطہ نظر سے غور کیجئے تو حضرت عمر کا یہ فیصلہ نہایت اہم اور دور رس ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر معاشرے میں کسی مباح اور جائز کام پر کثرت سے عمل ہونے کے باعث فساد اور ابتری پیدا ہونے لگے یا ابتری کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو' تو اس صورت میں اسلامی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حکماً" مباح پر عمل کرنے کو ممنوع قرار دیدے۔ اس حکم سے شریعت کے حکم میں کوئی تبدیلی لازم نہیں آتی۔ شرعاً" جو چیز مباح اور حلال ہے' وہ بہر حال مباح اور حلال رہے گی اور اس پر وہی احکام مرتب ہوں گے' البتہ معاشرے کو فساد اور ابتری سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اسلامی ریاست مباح پر عمل کرنے کو حکماً" روک سکتی ہے' کیونکہ اگر اسٹیٹ کو بھی مباحات کے معاملے میں داخل اندازی کا حق نہ ہو تو پھر معاشرے کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں آیا ہے یآیھا الذین امنوا اطیعوا للہ واطلیعو الرسول و اولی الا مر منکم اے ایمان والو تم اللہ کی' رسول کی اور تم میں جو صاحب اختیار و اقتدار ہیں' ان کی اطاعت کرو' فرمایا کہ اللہ اور رسول کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا بھی جو حکم صراحتاً" دیا گیا ہے' اس کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے!

3- اسی طرح قرآن مجید میں جہاں طلاق کے احکام بیان کیے گئے ہیں' (سورۃ البقرہ رکوع 29 و 30) وہاں مذکور ہے کہ دو مرتبہ طلاق کو عدت سے پہلے واپس لے لے (اگر طلاق رجعی ہے) یا مطلقہ سے قطع تعلق کر لے اور اس سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ اب اگر ان دو طلاقوں کے بعد شوہر ایک طلاق اور دے گا تو اب طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔ شروع میں حضرت عمر کا عمل بھی اسی پر تھا' لیکن جن آپ نے دیکھا کہ اگر کوئی شخص ایک ہی مجلس میں تین مرتبہ

طلاق کا لفظ کہے گا تو اس سے بھی طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔ حضرت عمر کا یہ حکم اصلاح معاشرے کی غرض سے تھا' تاکہ لوگ طلاق کے معاملے میں محتاط رہیں' جسے شریعت میں ابغض المباحات قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عمر کا یہ حکم قرآن سے ہرگز معارض نہیں ہے' کیوں کہ قرآن مجید کی آیات متعلقہ سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ دو طلاقوں کے وقفے کے بعد اگر کوئی شخص تیسری طلاق دیگا تو طلاق مغلظہ ہو جائے گی۔ لیکن قرآن اس بارے میں خاموش ہے کہ اگر تین طلاقیں ایک ساتھ اور ایک جملے میں دی گئی ہیں تو اس کا حکم کیا ہو گا۔ پس جب قرآن اس بارے میں خاموش ہے تو اب حکم دونوں قسم کا ہو سکتا ہے' حضرت عمر نے وقت کی ضرورت اور تقاضے کے پیش نظر حکم کی ایک جہت متعین فرما دی' یعنی ایک مجلس اور ایک ہی جملے میں کہی ہوئی تین طلاقوں کو طلاق مغلظہ کا حکم دے دیا۔ (یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ایک ہی مجلس میں دی گئی تین طلاقوں سے جو مفاسد پیدا ہوئے ہیں اور اس سے خواتین کو جن ہولناک مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے' اس کا صحیح اندازہ اہل نظر اور خواتین ہی لگا سکتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہ قول ابن قیم اپنی وفات سے پہلے اپنے اس فیصلے پر نادم تھے' اگر وہ مزید زندہ رہ جاتے تو اس فیصلے کو واپس لے لیتے۔ آج مسلم دنیا میں قانوناً" ایک ہی طلاق رائج ہے۔ ادارہ)

4- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر چون کہ احکام کے اغراض و مقاصد پر رہتی تھی' اس بنا پر غرض اور مقصد میں تبدیلی پیدا ہو جاتی تھی' تو حضرت عمر حکم بھی بدل دیتے تھے۔ مثلاً" عہد نبوی اور عہد صدیقی میں گھوڑوں پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی' لیکن حضرت عمر جانتے تھے کہ اس زمانے میں گھوڑوں کی تجارت نہیں تھی اور جو حضرات گھوڑے رکھتے تھے' جہاد کی غرض سے رکھتے تھے' اس بنا پر جب عہد فاروقی میں لوگ گھوڑے بھی تجارت کی غرض سے رکھنے اور ان کو پالنے لگے تو حضرت عمر نے گائے اور اونٹ پر قیاس کر کے گھوڑوں پر بھی

زکوٰۃ مقرر کر دی۔

5- حضرت عمرؓ کا طرز حکومت سر تا سر جمہوری تھا۔ اس بنا پر جب وہ کوئی اہم سیاسی یا مذہبی فیصلہ کرتے' تو باقاعدہ اسے مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کرتے اور آخر کار اپنی قوت استدلال سے سب کو اپنا ہم نوا بنا لیتے۔ مثلاً" پہلے سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ جو ملک فتح ہوتا تھا' اس کی اراضی فوجیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی' لیکن عراق کی فتح کے بعد حضرت عمر نے سیاسی و ملکی مصلحت کے پیش نظر اس دستور میں تبدیلی کے لیے' اکابر صحابہ سے مشورہ کیا اور فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ ملک کے فتح ہونے کے بعد اراضی باشندوں کے قبضے میں چھوڑ دی جائے اور باشندوں کو بھی ہر طرح آزاد رہنے دیا جائے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اور بعض دوسرے اکابر صحابہ نے مخالفت کی لیکن حضرت عمر کو اپنی رائے پر اصرار تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر مفتوحہ اراضی اسی طرح فوج میں تقسیم ہوتی رہی' تو آئندہ نسلوں کا حشر کیا ہو گا۔ بڑی گرم بحث ہوئی۔ مخالفین کا استدلال یہ تھا کہ پہلے سے یہی دستور چلا آ رہا ہے اور پھر جن لوگوں کی تلواروں نے ملک فتح کیا ہے' انھیں اس کی زمین پر قبضہ کرنے کا حق زیادہ ہے۔ آخر حضرت عمر نے قرآن مجید کی آیت للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم (الحشر) سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ اس آیت میں "والذين جآؤ من بعدهم بھی ہے اور اس سے ثابت ہے کہ فتوحات میں آیندہ نسلوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ حضرت عمر کا یہ استدلال اس درجہ قوی تھا کہ جب حضرت عمر نے کھڑے ہو کر اپنے موقف کی تائید میں ایک پر زور تقریر کی اور استدلال میں یہ آیت پڑھی تو سب شرکائے جلسہ ایک آواز ہو کر بول پڑے کہ بے شبہہ آپ کی رائے بالکل درست اور بجا ہے۔ حضرت عمر کے اس فیصلے کے بعد یہ اصول مسلم ہو گیا کہ آیندہ جو ممالک فتح ہوں گے' وہ فوج کی ملک نہیں ہوں گے' بلکہ حکومت کی ملک ہوں گے اور جو لوگ زمین

پر پہلے سے قابض ہوں گے' وہ ان کے قبضہ میں رہے گی۔ اس فیصلے کے بعد حضرت عمر نے مفتوحہ ممالک کے بندوبست اور ان کے انتظام کے لیے جہاں اور قواعد و ضوابط بنائے' زمینوں پر لگان کے لیے خراج اور عشر کا بھی ایک نظام بھی مرتب فرمایا

6- اسلام' حریت انسانی کا مذہب ہے' اس لیے وہ غلامی کو کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ چونکہ یہ رواج عام اور بین الاقوامی تھا' اس لیے اس کو یک لخت ختم کر دینا ممکن نہ تھا' تاہم اس رواج کو کم کرنے اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیمات اسلام میں کثرت سے ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ اگر غلام آقا سے یہ کہے کہ میں کمائی کر کے آپ کو اس قدر رقم دوں گا' آپ اس کے بدلے میں مجھے آزاد کر دیں' اصطلاح میں ایسے غلام کو مکاتب کہتے ہیں' قرآن مجید میں اس کا ذکر موجود ہے' لیکن حضرت عمر کے عہد تک غلام کی پیش کش کا قبول کرنا' آقا کے لیے لازمی اور ضروری نہ تھا۔ فقہا کا استدلال یہ تھا کہ قرآن مجید میں اگرچہ "کاتبوھم" بصیغۂ امر ہے' لیکن ساتھ ہی شرط : ان علمتم فیھا خیرا کی لگی ہوئی ہے' جس سے ثابت ہوا کہ غلام کی پیش کش کو قبول کرنا اس کے مالک کی صوابدید پر موقوف ہے۔ لیکن حضرت عمر کی طبع نکتہ رس نے محسوس کیا کہ یہ شرط اتفاقی ہے اور لازمی نہیں' اس بنا پر آپ نے اعلان کر دیا کہ غلام کی پیش کش کو قبول کرنا' مالک کے لیے ضروری اور واجبی ہے۔

7- اسی طرح "ام ولد" اس باندی کو کہتے تھے جس کے بطن سے اس کے مالک کی کوئی اولاد ہو جاتی تھی۔ عہد فاروقی سے پہلے ام ولد کی بیع جائز تھی۔ لیکن حضرت عمر نے اس کو ممنوع قرار دیا اور ان کا استدلال حضرت عائشہ کی اس روایت سے تھا' جس میں فرمایا گیا ہے : "اعتقھا ولدھا" یعنی بچے نے پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کو آزاد کر دیا۔

8- قرآن مجید میں ہے : واعلمو انما غنمتم من شئی فان للّٰہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتامی و المساکین وابن اسبیل ○ ترجمہ : اور جان لو تم (اے مسلمانو) کہ مال غنیمت میں جو کچھ تم کو ملے گا۔ اس میں 1/5 اللہ کے لیے، رسول، اقربا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہو گا۔ اس آیت کے بمو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول رہا کہ جنگ میں جو کچھ بھی غنیمت کے طور پر ہاتھ آتا تھا، اس کا پانچواں حصہ الگ کر دیا جاتا اور اس کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں، ان پر اسے تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ اسلام کا کام کرنے کے لیے وقف تھا، جس کے باعث آپ اپنی معاش کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ پھر آپ پر آپ کے ان اعزاو اقربا کا بھی حق تھا جو غریب اور ضرورت مند تھے اور جنھوں نے ہمیشہ آپ کا ساتھ دیا تھا، اس بنا پر آیت میں دوسرے مصارف کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اقربا کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اقربا تو بہت تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کو دلواتے تھے، کیون کہ انھوں نے ہی آپ کی مدد کی تھی اور وہ ضرورت مند بھی تھے عہد نبوی اور پھر عہد صدیقی میں اسی پر عمل ہوتا رہا، لیکن حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو آپ نے اس میں تبدیلی کر دی اور اعزا و اقربائے نبوی کو مال غنیمت کے مصارف سے خارج کر دیا، اگرچہ بعض صحابہ نے اس کی مخالفت کی لیکن فاروق اعظم کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ : (1) قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقربا کا حصہ مال غنیمت میں مقرر کیا گیا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ ان لوگوں کا حق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، اس بنا پر آپ کی وفات کے بعد، جب خود آپ کا حصہ ساقط ہو گیا، جن لوگوں کا حق آپ پر تھا، ان کا حصہ بدرجہ اولیٰ ساقط ہو جائے گا (2) علاوہ ازیں حضرت عمر سمجھتے تھے کہ محض قرابت نبوی کے باعث لوگوں کا مستقل طور پر مال غنیمت میں حصہ مقرر کر دینا

حقیقت پسندی سے بعید ہے کیونکہ آیندہ ان لوگوں میں مالدار بھی ہوں گے اور وہ بھی ہوں گے جنھوں نے اسلام کی کوئی خدمت بھی انجام نہیں دی' تو پھر قوم کے غریبوں' مسکینوں اور دوسرے مستحقین کا حق مار کر ہمیشہ ان لوگوں کو مالک غنیمت میں سے حصہ دلواتے رہنا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس معاملے میں حضرت عمر کا نقطۂ نظر کس درجہ حقیقت پسندانہ اور قرین حق و صواب تھا

۹۔ اس طرح قرآن مجید میں زکوٰۃ کے جو نو مصارف بیان کیے گئے ہیں' ان میں ایک گروہ مولفتہ القلوب کا بھی ہے۔ یہ گروہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا' مگر نیم دلی سے' اس لیے وہ پختہ مسلمان نہیں تھے۔ اس بنا پر ان لوگوں کی تالیف قلب کی خاطر مصارف زکوٰۃ میں ان کو بھی شامل کر لیا گیا۔ چنانچہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں مولفتہ القلوب کا زکات اور دوسرے صدقات و خیرات میں سے برابر حصہ ملتا رہا۔ لیکن حضرت عمر نے اس گروہ کو ساقط کر دیا۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ جب اسلام کمزور تھا اسے تالیف قلب کی ضرورت تھی۔ لیکن اسلام اب قوی اور مستغنی ہو گیا ہے' اس لیے اسے تالیف قلب کے حربے کو استعمال کرنے کی حاجت نہیں رہی۔

10- حضرت عمر کا یک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی فرماتے یا کرتے تھے' اس کے متعلق حضرت عمر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ حضور کا یہ قول اور فعل بحیثیت ایک رسول کے ہے یا بحیثیت ایک عرب کے۔ اگر پہلی صورت ہے' تو اس میں دم زدن نہیں اور نہ ہی کسی شخص کو اس میں اپنی رائے دینے کا حق' لیکن اگر دوسری صورت ہے تو مصلحت وقت کے پیش نظر اس میں ترمیم و تنسیخ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ خراج کی تشخیص' جزیہ کی تعیین' قید خانے کی ایجاد' وغیرہ یہ سب چیزیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجتہ اللہ البالغہ میں ایک مستقل باب کے

ماتحت سنن واجبہ اور سنن عادیہ کی جو محققانہ اور نہایت بصیرت افروز بحث کی ہے' اس کا اصل سرچشمہ حضرت عمر کا یہی طرز عمل ہی ہے۔

سطور بالا میں ہم نے عمر کے اجتہادات کی صرف چند مثالیں بطور مشتے نمونہ از خروارے لکھی ہیں' ورنہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان کے مطابق کم و بیش ایک ہزار مسائل ہیں جو حضرت عمر کے اجتہادات کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان پر مستقل ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے' ان پر ایک نظر ڈال لینے سے اس امر میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ جس طرح حضرت عمر نے ایک عظیم الشا ن فاتح کی حیثیت سے اسلامی ریاست کی توسیع و تنظیم کی' اس طرح اعلیٰ درجے کے مزاج شناس شریعت اور محرم اسرر دین کی حیثیت سے انھوں نے اپنے اجتہادات کے ذریعے استنباط مسائل اور استخراج احکام کے لیے ایک ایسے اصول و ضوابط کی نشان دہی بھی کی جو ہر زمانے کے مقننین و مجتہدین کے لیے شمع ہدایت اور رہنما اصول بنے رہیں گے۔

الم

رشي